بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

اشارات

مارشل لا کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ گھٹن کی اس فضا میں، ملک کی عظیم اکثریت کا ایک نمائندہ اجتماع بڑی کامیابی کے ساتھ شہر لاہور میں منعقد ہوا اور اس میں بڑے غور و فکر کے بعد قومی جدوجہد کے مقاصد اور خطوط متعین کیے گئے۔ جن حضرات نے اس اجتماع کی کارروائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ایسے متضاد خیال اور بے فکرے لوگوں کی بھیڑ نہ تھی جن کا دائرۂ عمل نشستند و گفتند و برخاستند تک محدود ہو، بلکہ یہ ملت کے ایسے دردمندوں کی مجلس تھی جو ملک کی موجودہ صورت حال کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کی اصلاح کے لیے ہوشمندی، معقولیت اور جرأت کے ساتھ جدوجہد کرنے کا عزم اور حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔

ملک و ملت کے بہی خواہوں نے کس قسم کی فضا اور کس ماحول میں اس جلسے کے انعقاد کا فیصلہ کیا اس کا اندازہ صوبائی وزیر قانون و اطلاعات کے ایک بیان سے لگایا جا سکتا ہے:

"اس کانفرنس میں تقاریر کی گئیں اور پھر انہیں سائیکلوسٹائل کر کے تقسیم بھی کیا گیا مگر حکومت نے اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ حکومت آسانی سے ان تقاریر پر پابندی عائد کر سکتی تھی۔ حکومت کانفرنس کے انعقاد کو بھی روک سکتی تھی۔ اس کانفرنس کے منتظمین کو بھی نظر بند کر سکتی تھی۔ ایسا خطرناک لٹریچر تیار کرنے والوں کو گرفتار کر کے ان کے خلاف مقدمہ چلا سکتی تھی لیکن حکومت نے ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا بلکہ انہیں

اجتماع اور اظہارِ خیال کی مکمل آزادی دے دی۔ ان تقاریر سے قانون کی کم از کم ایک درجن دفعات کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہنگامی قانون بھی موجود ہے اگر حکومت قانون کو حرکت میں لاتی تو حزبِ اختلاف کئی سالوں تک اپنے قائدین کی خدمات سے محروم ہو جاتی۔ مگر حکومت نے اپنا ہاتھ روکے رکھا"

(نوائے وقت مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۶۶ء)

ان نادر خیالات کو بار بار پڑھیے اور یہ حقیقت ذہن نشین رکھ کر پڑھیے کہ یہ باتیں حکومت کا کوئی عام کارندہ نہیں کر رہا بلکہ ان کا اظہار صوبے کا وزیر باتدبیر، جمہوریت اور آزادی کے اس دور میں، کسی نجی مجلس میں نہیں بلکہ ایک اخباری بیان میں کر رہا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ وزیر صاحب بھی کسی دوسرے شعبے کے نہیں، بلکہ اس شعبے کے ہیں جس پر عوام کے حقوق و فرائض کے تعین اور شہری آزادیوں کے تحفظ کی براہِ راست ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ان خیالات میں وہ ذہنیت صاف طور پر جھلکتی ہے جس کے ساتھ اس وقت پاکستانی عوام پر حکومت کی جا رہی ہے۔ اس بیان کا ایک ایک لفظ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اس ملک کے بسنے والوں کے کوئی شہری اور انسانی حقوق نہیں۔ وہ بیچارے اس سرزمین میں رہتے ہوئے سرے سے اس بات کا کوئی حق ہی نہیں رکھتے کہ اپنا مافی الضمیر کسی دوسرے شخص کے سامنے بیان کر سکیں یا اپنے داغہائے دل کسی دوسرے فرد کو دکھا سکیں۔ انہیں اگر اپنی عافیت مطلوب ہے تو اُن کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ملک کے معاملات کے بارے میں گونگے، بہرے اور اندھے بن کر رہیں۔ اگر اُن کا دل حکومت کے کسی طرزِ عمل سے غیر مطمئن ہے تو انہیں اسے بیان کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر سرکار کی کوئی روش انہیں مضطرب اور پریشان کرتی ہے تو انہیں اس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے زندہ رہنے کی مشق کرنا چاہیے۔ اور اگر اصحابِ اقتدار کی کوئی بات انہیں ناگوار گزرتی ہے تو انہیں اسے سننے سے پرہیز کرنا

چاہیے۔ حکومت کے نزدیک عوام کے لیے یہی روش پسندیدہ اور معقول ہے اور اگر وہ اس روش کو ترک کر کے کسی اہم سے اہم قومی مسئلے پر نہایت محتاط انداز میں بھی حکومت سے اختلاف کرتے ہیں، یا اس کے طرزِ عمل پر گرفت کرتے ہیں، تو یہ اُن کی بے جا جسارت ہے جس پر وہ ہر قسم کی سزا کے مستوجب ہیں اور حکومت اگر انہیں اس کی قرار واقعی سزا نہیں دیتی ہے تو یہ محض اُس کی فیاضی ہے کہ وہ ایسے "مجرموں" سے صرفِ نظر کر رہی ہے۔ وہ بحیثیت شہری حکومت سے اختلاف کرنے اور پھر اُسے تحریر و تقریر کے ذریعہ بیان کرنے کا کوئی حق ہی نہیں رکھتے۔ وزیر صاحب نے قومی کانفرنس کے منتظمین پر حکومت کے بے پایاں احسانات اور اُس کی فیاضیوں کا ذکر کرتے ہوئے صاف طور پر عوام کو بتایا ہے کہ انہیں اپنی قدر و عافیت اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے۔ اگر حکومت چاہتی تو مقررین کو تقریر کرنے سے بآسانی باز رکھ سکتی تھی، اس کانفرنس کے انعقاد کو روک سکتی تھی اور ایسی ناپاک جسارت کرنے والوں کو جیلوں میں ٹھونس سکتی تھی۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس قسم کا کوئی اقدام کرتے ہوئے وہ کسی غیر آئینی حرکت کا ارتکاب نہ کرتی بلکہ یہ ساری کرم فرمائیاں آئین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے دستور کے عین منشا و مرضی کے مطابق ہوتیں۔ کیونکہ موجودہ اقتدار نے ملک کو جس آئین سے سرفراز فرمایا ہے وہ اتنا ہمہ گیر اور شہری آزادیوں کے معاملے میں اتنا حساس ہے کہ اس میں حکومت اگر خود اختلاف رائے کی کسی آواز کو ازراہِ کرم سننا گوارا کرے تو یہ عین اس کا احسان ہے ورنہ دستور اور آئین کی رُو سے حکومت کے خلاف زبان کھولنے والوں کو ہر قسم کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اس دستور میں شہریوں کو اپنی رائے کے اظہار کی کتنی آزادی ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے وزیر صاحب کے ارشاداتِ عالیہ سے کافی حد تک رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔

آپ خود غور فرمائیں کہ ملک کی قریب قریب ساری سیاسی جماعتیں ملکی مسائل پر غور و فکر کے لیے ایک کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں اور اس غرض کے لیے حکومت سے ایک

پبلک پارک کے استعمال کی اجازت طلب کرتی ہیں۔ مگر انہیں اجازت نہیں ملتی۔ وہ پھر شہر سے دُور ایک معزز شخصیت کے دولتکدہ پر جمع ہونے کا فیصلہ کرتی ہیں۔ اس اجتماع کی نوعیت کسی جلسۂ عام کی نہ تھی بلکہ یہ آٹھ سو ایسے منتخب افراد کا اجتماع تھا جنہیں اپنے اپنے علاقوں میں نمائندہ حیثیت حاصل ہے۔ پھر یہ حضرات ہلڑ بونگ مچانے اور عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے جمع نہ ہوئے تھے بلکہ قوم کے اندر افسردگی اور سراسیمگی کی جو کیفیت طاری تھی اور جس کے متعلق اس بات کا خدشہ تھا کہ وہ کوئی خطرناک صورت اختیار کر سکتی ہے، اُسے مناسب راستے پر ڈالنے اور قوم کو کسی تعمیری راہ پر لگانے کے لیے آپس میں سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کے منتخب اجتماع میں بے ہنگم باتیں تو نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اس کانفرنس میں بالعموم جو تقریریں ہوئیں وہ کافی حد تک متوازن اور معقول تھیں اور ان میں جذبات کو برانگیختہ کرنے کے بجائے انہیں صحیح رُخ پر لگانے کے لیے غور و فکر کیا گیا۔ ان تقاریر کے بارے میں وزیر صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ ان سے قانون کی کم از کم ایک درجن دفعات کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ یہ ہے اس ملک میں اجتماع اور اظہارِ خیال کی مکمل آزادی کی اصل حقیقت جس کا تذکرہ جناب وزیر قانون صاحب نے بڑے فخریہ انداز میں فرمایا ہے۔

ہم اس ملک کے بہی خواہوں اور خاص طور پر یہاں کے دین پسند حضرات سے مؤدبانہ گزارش کرتے ہیں کہ خدارا اس صورتِ حال پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ ملک کس طرف جا رہا ہے۔ آپ کو اگر کسی فرد سے، کسی گروہ یا کسی پارٹی یا جماعت سے اختلاف ہے تو اُسے ضرور رکھیے۔ اگر آپ ان میں سے کسی کے طرزِ فکر یا طرزِ عمل سے مطمئن نہیں ہیں تو اس کا برملا اظہار کیجیے اور ان کی غلطیوں کو ان پر واضح کیجیے۔ دس کروڑ انسانوں کے فکر و عمل کے اندر اختلافات کے کئی پہلو ظاہر ہو سکتے ہیں۔ یہ اختلاف اگر نیک نیتی پر مبنی ہے تو کسی اعتبار سے بھی تشویشناک نہیں لیکن یہ ملک آہستہ آہستہ جس رُخ پر جا رہا ہے اور اس ملت کے مزاج میں جو غیر معمولی تبدیلی

لائی جارہی ہے وہ انتہائی اندوہناک ہے۔ ایک مختصر سی اقلیت نے ملک پر اس طریق سے قبضہ کر رکھا ہے کہ وہ جس طرح چاہتی ہے لوگوں کے جذبات سے کھیلتی ہے اور کسی کو اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں ہوسکتی۔ وہ جب چاہتی ہے اپنے حسبِ منشا آرڈیننس نافذ کر دیتی ہے۔ ان آرڈیننسوں نے شہری آبادی پر عرصۂ حیات اس قدر تنگ کر دیا ہے کہ وہ بیچاری اپنی اس مصیبت کو بھی بیان نہیں کرسکتی۔ اگر کبھی وہ اس کی جسارت کر بیٹھتی ہے تو اسے ہر قسم کے جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

آپ اگر پاکستان بلکہ پوری دنیائے اسلام کے حالات پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت آزادیٔ رائے کا مسئلہ اس کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ جب ایک مختصر سی اقلیت پولیس اور فوج کی مدد سے اپنے آپ کو عوام پر مسلط کرتی ہے تو پھر وہ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے ساری وہ تدابیر اختیار کرتی ہے جس سے عوام فکری اعتبار سے مفلوج رہیں اور ان کے اندر کوئی اجتماعی شعور پیدا نہ ہوسکے۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے لوگوں کو غیر ملبب کیا جاتا ہے اور اُن کے قلموں پر پہرے بٹھائے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنے مصائب کو کسی کے سامنے بیان نہ کرسکیں اور اس طرح تکلیفات کو دُور کرنے کے لیے کوئی تحریک منظم نہ کی جاسکے۔ پھر لوگوں کو آہنی گرفت میں رکھنے کے لیے پوری سرکاری مشنیری کو کام میں لایا جاتا ہے اور سرکاری حکام اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے بجائے اپنی بیشتر صلاحیتیں عوام پر برسرِ اقتدار طبقے کی گرفت مضبوط کرنے کے لیے صرف کرتے ہیں۔ اس سے ملک کا نظم و نسق تباہ ہوتا ہے اور شہریوں کے اندر اتنا خوف و ہراس پھیل جاتا ہے کہ وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اگر انہیں اس ملک میں اپنی جان و مال کی خیر مطلوب ہے یا انہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو انہیں حکومت کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، کیونکہ اگر وہ آن سے برہم ہوجائے تو وہ ہر قسم کی مراعات سے محروم ہوجائیں گے۔ اگر وہ تاجر ہیں تو اُن کے لائسنس منسوخ ہونگے، اگر وہ ملازم ہیں تو انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا، اگر وہ سیاسی کارکن ہیں تو اُن پر جھوٹے مقدمے قائم کیے جائیں گے اور اس طرح زندگی اپنی ساری وسعتوں کے باوجود نہ صرف اُن پر تنگ ہوجائے گی بلکہ اُن کے

لواحقین اور اُن کے عزیز و اقارب کے لیے بھی عذاب بن جائے گی۔

اِس دَور میں جبکہ ریاست کا دائرۂ عمل بے حد ہمہ گیر ہے اور زندگی کے سارے گوشوں پر پُوری طرح محیط ہے ایک انسان کہاں تک حکومت کی گرفت سے آزاد ہو سکتا ہے۔ وہ بیچارا ہزاروں بندھنوں میں بندھا ہُوا ہوتا ہے اور ہر قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ روٹی کے ایک ایک لقمے کے لیے وہ حکومت کا دست نگر اور محتاج ہے۔ دَورِ حاضر کی ریاست کا دائرۂ کار صرف نظم و نسق یا لوگوں کے جان و مال کی حفاظت تک محدود نہیں بلکہ یہ ایسا منظّم، ہمہ گیر اور مضبوط ادارہ ہے جو براہِ راست نہ صرف شہریوں کے فکر و نظر کی تربیت کرتا ہے بلکہ اُن کے ذوق، اُن کے طرزِ عمل، اُن کی سیرت کو اپنے دلپسند ڈھانچوں میں ڈھالتا ہے۔ نظامِ تعلیم پر اس کا قبضہ ہے۔ نشر و اشاعت کے سارے ادارے اس کے ہاتھ میں ہیں۔ رزق کی کنجیاں اس کے قبضے میں ہیں۔ ملک کی پُوری معیشت پر اس کا تصرّف ہے۔ اس غیر معمولی اختیار رکھنے والے ادارے نے جو پُوری زندگی پر محیط ہے، حیاتِ انسانی کے مختلف گوشوں کو از خود بُری طرح سمیٹ رکھا ہے اور انسان آمریت کے تسلّط کے بغیر ہی یہ احساس رکھتا ہے کہ اس کی زندگی کو کسی بہت بڑی طاقت نے بے بس بنا کر رکھ دیا ہے۔ اگر اُسے آزادی بھی حاصل ہو تو پھر بھی وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے خیالات کے اظہار کے جو ذرائع رکھتا ہے وہ حکومت کے وسائل کے مقابلے میں بالکل حقیر اور بے اثر ہیں۔

اس قدر غیر معمولی طاقت اور اثر رکھنے والی ریاست پر اگر ایک فرد یا چند افراد قبضہ کر لیں اور اس کی قوت کو آمرانہ انداز میں استعمال کرنا شروع کر دیں تو عوام کی بے بسی اور اُن کی مظلومیت کا کچھ اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

یُوں تو سارے مشرقی ممالک کو یہی روگ کھائے جا رہا ہے، لیکن خاص طور پر مسلم ممالک میں اس مرض نے بڑی تشویشناک صورت اختیار کر لی ہے۔ ان ملکوں کے عوام جن افکار و نظریات کے

علمبردار ہیں وہ اُن کا آزادانہ پرچار نہیں کر سکتے۔ ایک زبردست قوت اپنے وسیع اختیارات سے کام لے کر مسلمانوں کے دل و دماغ میں ایسے خیالات ٹھونستی ہے اور ایسے تہذیبی اثرات ان کی زندگی میں داخل کرتی ہے جنہیں اُن کی عظیم اکثریت انتہائی تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس صورتِ حال سے پریشان ہو کر اگر وہ اپنے اضطراب کا اظہار کرتے ہیں تو وہ اس کے لیے سارے راستے مسدود پاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ آہستہ آہستہ مضمحل ہو کر اپنی قوت و توانائی کھوتی جا رہی ہے۔ ریاست کو جو وسیع اختیارات حاصل ہو گئے ہیں وہ صنعتی دَور کی ناگزیر برائیاں ہیں جنہیں دُور کرنے کے لیے غیر معمولی قوت و طاقت اور دنیا کے معاملات میں بالادستی درکار ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس کی توقع دَورِ حاضر کے مسلمانوں سے اُن کی موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے نہیں کی جا سکتی۔ وقت کے دھارے کو بدلنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمان سب سے پہلے پوری دنیا سے اپنی فکری قیادت تسلیم کروائیں اور پھر جہاں جہاں انہیں اپنا نظامِ زندگی تشکیل کرنے کی آزادی ہے وہاں وہ عملاً یہ ثابت کر دیں کہ مغربی افکار اور مغربی طرزِ فکر کے مقابلے میں جو افکار اور طرزِ عمل وہ پیش کر رہے ہیں وہ ہر لحاظ سے بہتر اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے ضامن ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ دینِ حق کے علمبردار اہلِ مغرب کی ذہنی اور سیاسی غلامی سے یکسر آزاد ہوں اور انہیں اپنے دین پر غیر متزلزل اعتقاد ہو اور وہ اس دینِ حق کو دوسرے ادیان پر غالب کرنے کا غیر معمولی عزم رکھتے ہوں۔ اس بلند و بالا مقصد کی ابتدا ہر مسلم ملک میں اسی طرح کی جا سکتی ہے کہ وہاں کے عوام کو اس بات کا حق دے دیا جائے کہ وہ اپنے اجتماعی شعور کی اچھی طرح تربیت کر کے اپنے ہاں اُس قیادت کو اُبھار سکیں جو اُن کے عزائم اور امنگوں کی ترجمان ہو۔

یہ ہے وہ نقطۂ آغاز جہاں مسلم قوم کی قوتوں کو آپس کی سر پھٹول میں ضائع کرنے کے بجائے انہیں کسی تعمیری کام پر لگایا جا سکتا ہے۔ اس آغاز کا سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ مسلمان ممالک میں اظہارِ رائے کی زیادہ سے زیادہ آزادی ہو تاکہ مسلمانوں کے ذہن مفلوج اور اُن کے ضمیر مردہ ہونے

کے بجائے اُن میں توانائی پیدا ہو اور وہ بھلے اور بُرے کے درمیان تمیز کر کے بھلائی کے فروغ اور بُرائی کے خاتمے کے لیے فضا ہموار کر سکیں۔ اس سے زیادہ کسی قوم کی کیا بدنصیبی ہو سکتی ہے کہ اُس کی اپنی دولت اور قوت کا بیشتر حصہ خود اُسے بانجھ بنانے میں صرف کیا جاتے۔ قومیں محض کا غذی پلوں اور اونچی اونچی عمارات کی تعمیر سے نہیں بنتیں بلکہ زندگی کی حرارت اور ولولے سے بنتی ہیں۔ یہ حرارت اور ولولہ قوم کے جذبات کو دبانے اور اُس کے ضمیر کو مُردہ کرنے سے قائم نہیں رہتا بلکہ اپنی قوت و طاقت کا صحیح احساس اور اُسے تعمیری راہ پر لگانے کا جذبہ اس کے حفظ و بقا کا ضامن ہے۔ آج مسلم ممالک میں کیا ہو رہا ہے؟ اپنے بھائی بند ہی اقتدار کے نشے میں اپنے بھائیوں کا گلا گھونٹنے میں مصروف ہیں۔ مصر میں اخوان المسلمون جیسی فعال اسلامی تحریک کو جس طرح ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے وہ دنیائے اسلام کا ایک ایسا عظیم حادثہ ہے جس پر تمام مسلمانوں کو ٹھنڈے دل کے ساتھ غور و فکر کرنا چاہیے اور انہیں سوچنا چاہیے کہ آخر یہ تشویشناک صورت حال کن اسباب کا فطری نتیجہ ہے۔

وقتی اور ہنگامی اسباب کے پس پردہ اگر جھانک کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس حادثہ کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ مسلمانوں نے حالات کے رُخ کو جاننے میں سخت غلطی کی ہے انہوں نے تاریخ سے کوئی سبق نہ لیا اور اس حقیقت کو جاننے میں غفلت کی کہ جب نیک، خدا ترس اور مخلص افراد نے ملکی اور سیاسی مسائل کو "امورِ دنیا" قرار دے کر ان سے کنارہ کشی اختیار کی اور صرف چند مذہبی رسومات کی پیروی کو ہی مقصدِ حیات قرار دے لیا تو قوت و طاقت کے سب سے بڑے سرچشمے یعنی ریاست پر ایسے لوگ قابض ہو گئے جنہوں نے آہستہ آہستہ ایک منصوبے کے تحت "بے ضرر مذہبی رسومات" کی ادائیگی تک کو ان دین داروں کے لیے مشکل بنا دیا۔ برسرِ اقتدار گروہ نے ان حامیانِ مذہب کی غفلت سے پُورا پُورا فائدہ اٹھا کر ملک کے اندر مذہب سے انحراف کی ایک ایسی معاندانہ فضا قائم کر دی جس میں یہ "خدا پرست"

اپنے وطن، اپنی قوم، اپنے معاشرے بلکہ خود اپنے خاندان میں اجنبی بن کر رہ گئے اور زندگی انہیں ایک ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس ہونے لگی۔ ان کے اندر احساس کہتری پیدا ہو گیا اور وہ سوسائٹی میں ایک بالکل بے کار اور غیر مؤثر قوت کی حیثیت سے جینے پر مجبور ہو گئے[1]۔ جس طبقے کے لیے سانس لینا دو بھر ہو جائے وہ ماحول پر کس طرح اثر انداز ہو سکتا ہے۔

یورپ میں آج جو الحاد اور بے دینی پھیلی ہوئی ہے وہ سب مذہب کے علمبرداروں کی امورِ دنیا سے بے تعلقی کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ ان حضرات نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق ہے اور اس کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ یہ انسان کے نفس کو دنیاوی آلائشوں سے پاک کرے۔ اس بنا پر خدا کے پرستاروں نے اور مذہب کے علمبرداروں نے دنیا کو ایک ناپاک چیز سمجھ کر اُس سے منہ موڑ لیا اور تمام امورِ دنیا کی زمامِ کار آہستہ آہستہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو اوّل درجے کے عیّار، چالاک اور خائن تھے۔ انہوں نے مذہب کے بجائے الحاد کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کا رہنما

---

[1] یہ مذہبی لوگ کس قدر کس مپرسی کی حالت میں ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی بہت زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں، صرف روزمرہ کے واقعات پر ایک نگاہ ڈالنے سے اس کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ میں یہاں صرف ایک واقعہ درج کرتا ہوں۔ ایک نہایت دیندار گھرانے کے نوجوان نے رقص کی مشق کے لیے رقص گاہ میں باقاعدہ حاضری دینی شروع کی۔ اس کے والد نے جو اپنی ذات میں بڑے متقی اور پرہیزگار ہیں، مجھ سے اس کا ذکر کیا اور بڑی دردمندی کے ساتھ مجھ سے فرمایا کہ انہیں صاحبزادے کی اس حرکت سے سخت تکلیف ہوتی ہے اس لیے میں اُسے کسی طرح اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کروں۔ مَیں نے اُسے بہت سمجھایا مگر اس پر خاک اثر نہ ہوا۔ بالآخر میں نے اس کے جذبات سے اپیل کرتے ہوئے یہ کہا کہ تمہیں اپنے والد صاحب پر تو رحم کھانا چاہیے۔ اس پر اِن صاحبزادے نے بڑی بے تکلفی

اصول بنا کر معاشرے کی تعمیر کر ڈالی۔ لامذہبیت کا طوفان ان "خدا پرستوں" کے گھروں سے ٹکرا رہا تھا مگر ان غفلت کے ماروں کو کوئی خبر نہ تھی کہ ان کے مذہب کو کتنا شدید خطرہ لاحق ہے۔ الحاد نے پوری قوت کے ساتھ مذہب کو زندگی کے ہر میدان میں پچھاڑنا شروع کیا اور مذہبی طبقوں نے اسکا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بجائے قدم قدم پر اُس کے ساتھ مصالحت کی۔ ہر گام پر اپنی شکست کو تسلیم کیا اور خود اُس کے لیے میدان خالی کر دیا تاکہ وہ آزادی کے ساتھ من مانی کارروائیاں کرتا رہے۔

اس کے دو نتائج برآمد ہوئے۔ ایک یہ کہ الحاد کا دائرہ مسلسل پھیلتا رہا۔ اُس نے سیاست پر تسلط قائم کیا۔ اس نے معیشت کو اپنی آہنی گرفت میں لیا۔ اس نے معاشرت پر یلغار کی۔ اس نے نظامِ تعلیم میں پوری طرح سرایت کی۔ اس کے مقابلے میں مذہب کا دائرہ برابر سکڑتا چلا گیا۔ اہلِ مذہب نے سب سے پہلے سیاست کو دنیا داری کہہ کر اُسے خیرباد کہا۔ پھر معیشت کو زندگی کا ایک ناپاک شعبہ سمجھ کر اس سے پہلوتہی کی۔ پھر معاشرت سے اپنے آپ کو بے دخل کیا۔ پسپائی کا یہ سلسلہ جب ایک مدت تک جاری رہا تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ کفر و الحاد دنیا کی ایک مؤثر اور فیصلہ کُن قوت بن کر رہا اور مذہب اس سے پوری طرح مغلوب ہو گیا۔ پسپا ہوتے ہوئے کئی مقامات پر مذہب نے قدم جمانے کی کوشش کی۔ لیکن الحاد نے اس کا کہیں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور خود اس کے سب سے زبردست حصار یعنی عبادت گاہوں تک میں اس کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ وہ مذہب جو کبھی دنیا میں ایک انقلاب انگیز تحریک کے طور پر اٹھا تھا اور جس نے زندگی کے سارے

سے یہ کہا:

DADDY IS A FOOL IF HE MINDS SUCH ORDINARY THINGS

"ابا بے وقوف ہیں اگر وہ ایسی معمولی باتوں کو محسوس کرتے ہیں"۔

اس سے خود اندازہ لگا لیجیے کہ ماحول کے بدل جانے سے انسان پر عرصۂ حیات کس طرح تنگ ہو جاتا ہے۔

شعبوں کو خدا پرستی کی بنیاد پر تعمیر کیا تھا وہ مذہب پرستوں کی ایک بنیادی غلطی کی وجہ سے محض مخصوص قلبی واردات اور کیفیات کا نام بن کر رہ گیا۔

دوسرا نتیجہ یہ ہُوا کہ کفر کے ساتھ مصالحت کی پالیسی نے مذہب کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ دو متضاد اور متناقض اشیاء کا اجتماع کبھی کوئی اچھے نتائج پیدا نہیں کرتا۔ اس سے دونوں کی تخلیقی قوتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ پھر جب یہ اجتماع ایک جیسی قوت رکھنے والے عناصر کے درمیان نہیں بلکہ غالب و مغلوب عناصر کے درمیان ہو تو سارا نقصان مغلوب عنصر کو ہی پہنچتا ہے اور وہی اپنی شکل و صورت، اپنی ہیئت، اپنا مزاج اور اپنی بنیادی خصوصیات کو غالب عنصر کے زیر اثر بدلنے کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مصالحت، بلکہ مذہب کی کفر کے ہاتھوں اس شکست کی وجہ سے اُس میں اتنے تغیرات آئے کہ اُسے کفر سے ممیز اور ممتاز کرنا مشکل ہو گیا اور اس طرح مغربی زندگی کی باگ ڈور عملاً کفر کے ہاتھ میں آ گئی۔

آپ خود غور فرمائیں کہ آخر مذہب جیسی بنیادی چیز جو ہوا اور پانی کی طرح انسان کی فطری ضرورت ہے وہ انسانی معاشرے میں کیوں اتنی بے اثر ہو کر رہ گئی اور اس نے حیاتِ انسانی میں ایک مؤثر طاقت بننے کے بجائے کفر کے رحم و کرم پر کیوں زندہ رہنا گوارا کیا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ مذہب کے علمبرداروں نے اجتماعی زندگی کی غیر معمولی قوت کو سمجھنے میں غلطی کی اور اس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف انفرادی اصلاح پر سارا زور صرف کر دیا، اور جب کفر و الحاد کا طوفان اٹھا تو اس نے پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اسی صورتِ حال سے اس وقت پوری دنیائے اسلام دوچار ہے۔ غیر اسلامی طاقتیں پوری شدت کے ساتھ اسلام پر حملہ آور ہیں۔ انہوں نے ہر میدان میں اسلامی اور دینی قوتوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہے اور انہیں گھیرے میں لیکر پورے زور کے ساتھ پیچھے دھکیل رہی ہیں۔ مگر مسلمان زعما کی عظیم اکثریت اس خطرے کو قطعاً محسوس نہیں کرتی اور سادگی سے یہ سمجھ رہی ہے کہ جب تک

اُسے سجدے کی آزادی حاصل ہے۔ اُس کے دین اور اُس کے ایمان کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچنے کا سرے سے احتمال ہی نہیں۔ بلکہ جو لوگ اُنہیں اُن کی اس غفلت پر متنبہ کرتے ہیں اور خود اس یلغار کو اپنی تھوڑی سی قوت کے ساتھ روکنے کی کوشش کر رہے ہیں انہیں "اقتدار کے حریص" ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے اور ان کی سعی و جہد کو "دنیا پرستی" کہہ کر بڑی حقارت کے ساتھ ٹھکرایا جا رہا ہے۔ بلکہ بعض حالات میں آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکنے اور اسے ناکام بنانے کو بہت بڑی دینی خدمت سمجھ کر اس میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی جاتی ہے اور اس مقصد کے لیے بعض ایسے طبقوں اور گروہوں کے طرزِ عمل کی پشت پناہی کی جاتی ہے جو اسلام کو دنیا میں ایک بے وزن قوت بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔

اسلام پر جس طرح عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے اُسے یہ مقدس حضرات خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ دینِ حق اپنے پیروؤں کی کمزوری کی وجہ سے جس طرح آج مغلوب ہے اس پر کبھی کبھی ان کی آنکھیں پُرنم بھی ہو جاتی ہیں۔ وہ اس حقیقت کو بعض اوقات بڑی شدّت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ باطل قوتوں نے انہیں پوری طرح اپنے نرغے میں لے رکھا ہے لیکن وہ اس طریق کار کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جس کے تحت یہ سب کچھ بتدریج ہوا ہے۔ انہیں یہ غلط فہمی ہے کہ یہ صرف چند افراد کی ذاتی کوتاہیوں اور لغزشوں کا نتیجہ ہے ورنہ اسلام کو کوئی حقیقی خطرہ لاحق نہیں۔ حالانکہ اصل صورت اس سے یکسر مختلف ہے۔ یہ افراد اپنی کوئی ذاتی رائے نہیں رکھتے۔ ان میں کوئی اتنا ذہین اور فطین بھی نہیں جو خود کوئی مربوط نظامِ فکر و عمل پیش کر سکے اور اُسے کسی معاشرے میں کوئی فیصلہ کُن قوت بنا سکے۔ ان لوگوں کی حیثیت مغربی نظامِ حیات کے کارندوں کی سی ہے جو اس کے تسلّط اور برتری کو قائم کرنے کے درپے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے مسلم ممالک کے ذرائع و وسائل وہاں کے عوام کی منشا اور مرضی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ مغرب اس میدان میں بھی وہی چالیں چل رہا ہے جو وہ اپنے سیاسی حریفوں کو زیر کرنے کے لیے

چلتا ہے، یعنی اپنے مخالف کی پوری طرح ناکہ بندی کر کے اس کے گرد زبردست گھیرا ڈال دیا جائے اور پھر اُس گھیرے کو اس حد تک تنگ کر دیا جائے کہ دشمن کے لیے بجز مغلوب ہو کر جینے کے اور کوئی صورت باقی نہ رہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ مغربی نظامِ حیات نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کس بُری طرح اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور یہ گھیرا ایک زبردست اور مضبوط آہنی زنجیر بن کر انہیں کس شدت کے ساتھ اپنی جکڑ بندیوں میں لے چکا ہے۔

مغرب جس طرح کا معاملہ مشرق اور خاص طور پر اسلامی ممالک کے ساتھ کرتا رہا ہے اور اُس کے جو آئندہ عزائم ہیں انہیں جاننے کے لیے عقل کی کوئی بہت زیادہ مقدار درکار نہیں۔ اس کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آزادی اور جمہوریت کی جس فضا کو اہلِ مغرب اپنی اجتماعی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، مسلم ممالک کے معاملہ میں اُسی کی پورے زور کے ساتھ مخالفت کرتے ہیں اور یہاں بالواسطہ اور بلاواسطہ ان قوتوں کی حمایت کرتے ہیں جو دنیائے اسلام کو آزادی کی فضا سے محروم رکھیں۔ انہیں اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ اگر مسلم ممالک میں آزادی اور جمہوریت کو فروغ کا موقع ملا اور مسلم قوم کی امنگوں اور آرزوؤں کو بروئے کار آنے کی کوئی صورت پیدا ہو گئی تو پھر مسلمانوں کی تخلیقی قوتیں پروان چڑھیں گی، اُن کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو گی، انہیں اپنے افکار و نظریات کے مطابق زمامِ کار سنبھالنے کی تربیت ملے گی اور اس طرح وہ مغربی طاقتوں سے ہر میدان میں مرعوب و مغلوب ہونے کے بجائے اس تہذیبی حصار کو توڑنے کی کوشش کریں گے جس نے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔

مسلم قوم کو اگر دنیا میں اسلام کے علمبردار کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو اس کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ وہ اپنے ہاں آزادی کی فضا قائم کرنے کی کوشش کرے جس میں وہ اپنے آپ کو مغربی یلغار کے مقابلے میں منظم اور متحد کر سکے، مغرب کی ریشہ دوانیوں کے خلاف رائے عامہ کو

ہموار کر سکے، اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کر کے انہیں دُور کرنے کی مختلف تدابیر سوچ سکے اور پھر ان تدابیر کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پُوری آزادی کے ساتھ بروئے کار لا سکے۔ ظاہر بات ہے یہ کام کسی ایسے ماحول میں تو نہیں کیا جا سکتا جس میں قلم پہ قدغن اور زبان پر پہرے ہوں، جہاں اجتماعی شعور اور اجتماعی احساس کی تربیت کے راستوں میں ان گنت رکاوٹیں حائل ہوں، جہاں ملّی عزائم کے مطابق زندگی کی تعمیر قریب قریب ناممکن ہو. بلکہ عزائم کو کچلنے اور انہیں مضمحل کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جاتے ہوں۔

آزادی کے ثمرات سے جمہوری ماحول ہی میں پُورا پُورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ آپ اگر کسی قوم کے شعور کی تربیت بھی کر دیں اور اس کے اندر اپنی قوتوں کو اسلام کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کے مطابق تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کا ولولہ بھی پیدا کر دیں، پھر بھی جب تک وہ پُرامن طریق سے اپنی اجتماعی زندگی کے ڈھانچوں کو اپنے دل پسند افکار و نظریات کے مطابق عملاً تبدیل کرنے کی قدرت نہ رکھتی ہو اس وقت تک اس کا اجتماعی شعور اور احساس کسی لحاظ سے بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ قوم کے اندر اضمحلال اور مایوسی پھیلانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ وہ عزائم اور ارادے جو بالکل پختہ ہو چکے ہیں، جنہیں دل و دماغ نے پُوری یکسوئی کے ساتھ قبول کر لیا ہو اور جن کی صحت اور افادیت کے متعلق انسان کو یقین کامل ہو چکا ہو، وہ اگر قومی زندگی میں اچھی طرح بروئے کار نہ آسکیں تو اس سے عوام کے اندر شدید اضطراب پیدا ہوتا ہے جو کسی لحاظ سے بھی کوئی صحت مند علامت نہیں۔

آزادی اور جمہوریت کے معاملے میں ایک چیز ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ انسان کا یہ پیدائشی حق اپنی نوعیت کے اعتبار سے جتنا مقدس اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے جتنا ضروری ہے اسی نسبت سے یہ انسان پر بھاری ذمّہ داریاں بھی عائد کرتا ہے۔ یہ حق انسان کی محدود خود مختاری

اور اُس کے شرف سے وابستہ ہے اور اس کا مقصد مخلوق میں انسان کی برتری ثابت کرنا ہے۔ یہ درحقیقت فرشتوں کے اُس خدشہ کی عملی تردید ہے کہ انسان کو جب بھی آزادی اور شعور کی نعمتیں حاصل ہوئیں تو وہ لازمی طور پر دنیا میں شر اور فساد پھیلائے گا۔ باری تعالیٰ نے انسان کو یہ حق ادا کر کے اس کی فطری شرافت پر اعتماد کیا ہے اور اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وہ فطرت کے اعتبار سے شرارت اور تخریب پسند نہیں اور اُسے اگر اپنی خود مختاری سے فائدے اٹھانے کا موقع دیا گیا تو وہ اسے انسانیت اور کائنات کی بربادی کے لیے نہیں بلکہ تعمیر و ترقی کے لیے استعمال کرے گا۔ اس بنا پر انسان کا کوئی قدم بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا جس کے پیچھے وقتی ہیجانات کے بجائے تعمیری جذبات کارفرما نہ ہوں۔ یہ تعمیری جذبات آناً فاناً پیدا نہیں ہو جاتے۔ ان کے لیے افراد اور قوموں کو مسلسل ریاضت کرنا پڑتی ہے تب کہیں جا کر اُن کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں تعمیر کا پہلو غالب آتا ہے۔

انگریز کی غلامی سے ہماری ملّت کو جو شدید نقصانات پہنچے ہیں ان میں ایک نقصان یہ ہے کہ ہم کسی منصوبے کے تحت کوئی مستقل اور ٹھوس کام لے کر آگے نہیں بڑھ سکتے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم قومی فلاح و بہبود کا کوئی لمبا منصوبہ تیار نہیں کر سکتے۔ وقتی طور پر قوم پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو ہم مضطرب ہو کر اس کے تدارک کی فکر کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں لیکن جلد ہی ہمارا ولولہ اور ہمارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور ہم تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمارے اس اضمحلال سے پھر جو چاہتا ہے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ ہماری قوم کے دردمندوں اور بہی خواہوں کو اس خامی کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔